ڈاکٹر محمد ریاض

کلامِ اقبال کے چند نکات

نکتہ جس کی جمع نکت اور نکات ہے، اس باریک اور لطیف بات کو کہتے ہیں جو کم لوگوں کو سوجھے۔ "نکتہ"، صاحبانِ ذوق سے قدردانی اور استحسان کا طالب ہوتا ہے۔ عرفِ عام میں لوگ مزاح اور معمولی باتوں کو بھی "نکتہ" کہہ دیتے ہیں مگر حقیقت میں نکتہ آفرینی کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے اور یہ ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔ علامہ اقبال ایسے نکتہ آفرین اور نکتہ شناس مفکر شاعر کے ہاں نکات کا معیار بھی بلند ہے۔ یہاں دو تین ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جنھیں علامہ نے خود "نکتہ" قرار دیا ہے۔

پہلی مثال مثنوی اسرارِ خودی (الوقت سیف) سے ہے۔ اقبال یہاں غلام اور آزاد افراد کا فرق بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

نکتہ‌ای می‌گویمت روشن چو دُر   تا شناسی امتیاز عبد و حُر
عبد گردد یاوہ در لیل و نہار   در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار
عبد چون طائر بدام صبح و شام   لذتِ پرواز بر جانش حرام
سینۂ آزادۂ چابک نفس   طائرِ ایام را گردد قفس
عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است   وارداتِ جانِ او بی ندرت است
دم بدم نو آفرینی کارِ حُر   نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر
عبد را ایام زنجیر است و بس   بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس
ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر   حادثات از دستِ او صورت پذیر (کلیاتِ اقبال ص [illegible])

یعنی غلام بے مقصد زندگی گزارتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر اور مقلد ہے اور ہر وقت تقدیر کا شاکی رہتا ہے جبکہ آزاد انسان زندگی سے حیرت انگیز استفادہ کرتا ہے۔ وہ جدت و اختراع کا دلدادہ ہے اور گویا اپنی تقدیر

کا خالق ہے۔

دوسری مثال زبورِ عجم (گلشن راز جدید سوال ۳) سے ہے۔ اقبال زمان و مکان کے اعتباری اور غیر حقیقی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے معراج شریف کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

سہ پہلو این جہانِ چون و چند است　　خرد کیف و کم او را کمند است
جہانِ طوسی و اقلیدس است این　　پی عقل زمین فرسا بس است این
زمانش ہم مکانش اعتباری است　　زمین و آسمانش اعتباری است
گمان را زکن و اماج دریاب　　زحرفِ نکتۂ معراج دریاب

حقیقت لازوال و لامکان است
مگو دیگر کہ عالم بیکران است

(کلیاتِ اقبال ص ۵۴۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات لامحدود فاصلے طے فرمائے، خدا کی بے شمار قدرتیں دیکھیں اور حقائق جمع فرمائے مگر اہلِ زمین کے لیے اس دوران چند لمحے ہی گزرے تھے۔ بنا بر ایں زمان و مکان کا وجود عقل و خرد کا تراشا ہوا ایک صنم ہے۔

تیسری مثال جاوید نامہ سے ہے (فلک عطارد)۔ محدود اور عالمی وطن کا رابطہ سمجھانے کی خاطر اقبال کہتے ہیں:

آن کف خاکی کہ نامیدی وطن　　این کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتی است　　زانکہ از خاکش طلوع ملتی است
اندرین نسبت اگر داری نظر　　نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب　　با تجلی ہای شوخ و بی حجاب
در تب و تاب است از سوز درون　　تا ز قیدِ شرق و غرب آید برون
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست　　تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است　　گرچہ او از روی نسبت خاوری است (کلیاتِ اقبال ص ۶۱۱)

ہر کسی کو اس کے وطن کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے۔ حبِّ وطن عقل و دین کا تقاضا ہے مگر مومن کے لیے یہ پوری کائنات ایک وسیع تر وطن ہے۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے مگر اس کی روشنی تمام کائنات پر چھا جاتی ہے۔ وہ مشرقی ہے اور عالمی بھی۔ کسی کو اس کی مشرقی نسبت پر اصرار ہے نہ اس کی عالمی نسبت سے انکار۔

ان تینوں مثالوں میں جو بالترتیب خلاصہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، اقبال نے بجا طور پر "نکتہ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بے نظیر نکات ایک طویل توضیح کا تقاضا کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری اول سے آخر تک مشاہداتی نکتوں سے بھری ہوئی ہے۔ بانگِ درا کا حصہ اوّل (۱۹۰۵ء تک کا کلام) ہی دیکھیں۔ اس میں پھول، ابر کہسار، شمع، شمع و پروانہ، آفتابِ صبح، گل مژمردہ، ماہِ نو، جگنو اور ستارۂ صبح کے بارے میں جو اس سال شاعر کے مشاہدات اکثر عمر رسیدہ شعرا کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ مثلاً شمع سے شاعر نے اپنا جو موازنہ کیا، وہ کتنا نکتہ آفریں ہے۔ شاعر عاشق بھی شمع کی طرح دردمند ہے مگر وہ سوز جدائی سے گریاں ہے جبکہ یہ لاشعور اور اپنی سرشت سے مجبور ہو کر اشک فشاں ہے۔ شمع کی یک بینی بے شک وحدتِ انسانی اور امن و صلح کی روش سمجھاتی ہے مگر امتیاز، آگاہی اور اضطراب سے ہی دنیا کی رونق ہے اور شمع ان صفات سے بے بہرہ ہے:

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع دردمند — فریاد در گرہ صفت دانۂ سپند
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے — اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمع بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حال اشکِ غم سے رہی ہم کنار تو

یک بین تری نظر صفتِ عاشقانِ راز — میری نگاہ مایۂ آشوب امتیاز
کعبے میں، بت کدے میں ہے یکساں تری ضیا — میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

ہے شانِ آہ کی ترے دود سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں ۔۔۔ بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں
میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی ۔۔۔ آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی
تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا
یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار ۔۔۔ خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی میں ہے ۔۔۔ گل میں مہک شراب میں مستی اسی میں ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی ۔۔۔ (بانگِ درا: ۴۴-۴۵)

"آفتابِ صبح" کی عالمگیر نور افگنی کو دیکھ کر شاعر کی نگاہِ مشاہدہ اسے یہ سمجھاتی ہے کہ:

زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے ۔۔۔ آرزو ہے کچھ اسی چشمِ تماشا کی مجھے
بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں ۔۔۔ نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں ۔۔۔ ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے ۔۔۔ حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے (بانگِ درا، ص ۴۹)

مگر سوزِ آدم زاد، آفتابِ عالم تاب کی نور افگنی سے کہیں بہتر اور برتر ہے:

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں ۔۔۔ یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں
اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ۔۔۔ ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں
نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا ۔۔۔ اور تو منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا
آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے ۔۔۔ لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے ۔۔۔ لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں ۔۔۔ جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں (بانگِ درا، ص ۴۹-۵۰)

بانگِ درا کے مذکورہ حصے میں بعض انگریزی منظومات کے تراجم و ماخوذات نظر آتے ہیں اور ان نظموں میں

بھی نکتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ دراصل اس دور میں بھی اقبال کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ "شاعر" کے عنوان سے مندرجہ ذیل اشعار اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں:

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم — منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم — شاعرِ رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ — کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ (بانگِ درا، ص ۱۰۱)

یورپ کے سہ سالہ قیام کے دوران (۱۹۰۵ - ۱۹۰۸ء) بھی اقبال نے جالبِ نظر شاعرانہ نکتے بیان کیے ہیں۔ "اخترِ صبح"، "۔۔۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر"، "کلی" اور "چاند اور تارے" عنوانات کی نظمیں اس ضمن میں توجہ طلب ہیں۔ آخری نظم "چاند اور ستارے" کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ ستارے اپنی اس شبانہ روز بھاگ دوڑ سے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہیں، مگر چاند کہتا ہے:

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں (بانگِ درا، ص ۱۱۹)

اپنی شاعری کے اس دوسرے دور میں اقبال نے اپنے عزم بالجزم کا بانگِ بلند اعلان بھی کر دیا تھا کہ:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو — شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

ستارہ

ستارے، اجرامِ فلکی اور ساری مخلوق، از روئے قرآن مجید، مشاہدہ طلب اور توحید آموز ہے۔ ستارے کی مناسبت سے اقبال نے بعض دقیق مضامین پیدا کیے ہیں۔ کبھی وہ ستارے کی چمک کو کپکپاہٹ قرار دے رہے ہیں کہ طلوعِ آفتاب ہی اسے اپنا غروب و عدمِ نور نظر آ رہا ہوتا ہے۔ بعض جگہ انھوں نے ستاروں کی جگمگاہٹ کو تبسم ریزی کہا ہے۔ ستارے حوادثِ عالم کو دیکھتے اور سفر کی صعوبتیں سہتے رہتے ہیں مگر ان کے طرزِ عمل میں فرق نہیں آتا۔ پھر بھی وہ ویسے ہی متبسم اور دل خوش کن نظر آتے ہیں۔ بعض مواقع پر اقبال

نے فرمایا ہے کہ ستاروں کی شب بیداری میں، ہمارے لیے سحر خیزی اور زندگی میں بیداری نیز سخت کوشی کا اشارہ پنہاں ہے۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹ دراصل ہماری توجہ مبذول کرنے کے لیے ہے تاکہ ہم بھی بیدار اور سرگرم عمل رہیں۔ ستارے ایسا نظر آتا ہے کہ، زنجیروں میں بندھے ہوئے مقررہ راستوں پر رواں دواں ہیں۔ وہ اپنے انفرادی فرائض ادا کرتے اور اجتماعی کاموں میں دمساز نظر آتے ہیں۔ غرض ان کی پررونق بزم میں 'خودی' اور 'بے خودی' کی شانیں جلوہ گر ہیں۔ کلام اقبال میں ستارے کا احاطہ ایک جداگانہ مقالے یا کتاب کا متقاضی ہے۔ ہم صرف ان نکتہ آفرینیوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

چمکنے والے مسافر، عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے، دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر — فنا کی نیند، مئے زندگی کی مستی ہے
وداع غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل — عدم، عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں (بانگ درا)

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی — مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا — کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی (بال جبریل، ستاروں کا پیغام)

از رضا مسلم مثال کوکب است — در رہ ہستی تبسم بر لب است
رشتۂ این قوم مثل انجم است — چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است (رموز بے خودی)

حسن ازل ہے پیدا، تاروں کی دلبری میں — جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا — قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم — داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے — جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے — پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں (بانگ درا)